خطبات متعلق کارنامۂ حسینی و مجاہدۂ کربلا

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

شہادت زار کربلا

(جو تقریر شب یازدہم محرم ۱۳۶۳ھ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر ہوئی)

کس کے دل میں اتنی طاقت ہے کہ وہ آج شہادت زارِ کربلا کی سیر کرے۔

ایک دل اُلجھانے والی خاموشی، ایک دم گھٹانے والی اُداسی۔ وہ قافلہ جو دوسری محرم کو اس سرزمین پر اُترا تھا آج اپنا اسباب باندھ کر چلا جاچکا ہے اس لئے سناٹا چھایا ہوا ہے............ یقیناً یہ منظر دل ہلا دینے والا ہے مگر انسان بھی عجیب چیز ہے۔ وہ ہر نئے حادثہ کی کیفیتیں دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ چاہے بعد میں اس کو تکلیف بھی پہنچے۔ پھر بھی وہ واقعات معلوم ضرور کرتا ہے۔ جب ایسا ہے تو ذرا دل مضبوط کر کے میرے ساتھ چلو اور کربلا کے مختلف مناظر کی اس وقت سیر کرو۔

وہ دیکھو ایک بے شمار خیموں اور چھولداریوں کا سلسلہ جن میں سے اکثر میں چراغ روشن ہیں۔ اور وہ بہت سے خیموں کے جھرمٹ میں ایک بڑا خیمہ جس میں تیز روشنی ہے...... ضرور یہ روشنی تمہاری نگاہ کو سب سے پہلے جذب کرے گی اس لئے چلو یہاں دیکھ لیں کہ کیا ہورہا ہے۔ یہ یزیدی فوج کے سالار عمر سعد کا خیمہ ہے جہاں اس وقت فتح کی خوشیاں منائی جارہی ہیں۔ تمام بڑے افسر جمع ہیں۔ پیغمبرِ اسلام کے نواسے کا تین دن کی بھوک پیاس میں خنجر ظلم سے گلا کاٹنے والے اپنے کارنامے پر ناز کررہے ہیں اور ایک ایک شہید کی شجاعت کے تذکرہ کے ساتھ اس کے قتل کرنے والے کی تعریفیں ہورہی ہیں............ اگرچہ سیکڑوں خیموں سے اس وقت زخمیوں کی کراہ کی آواز اور بیبیوں سے مقتولین کے غم میں نالہ وشیون کی آوازیں بھی بلند ہیں مگر نتیجہ کی کامیابی نے کانوں کو اس طرح کی آوازوں سے بند کردیا ہے اور شراب ناب کے دور کے ساتھ فتح وظفر کا نشہ سب کو بے خود بنائے ہوئے ہے۔ یقین ہے کہ تم سینہ میں ایک شریف انسانی دل رکھتے ہو اس لئے اس منظر کو دیکھ کر خوشی میں شریک ہونے کے بجائے نفرت وحقارت کے جذبات محسوس کرنے لگو گے۔ تمہارا ضمیر ملامت کرے گا اور تمہاری انسانیت چیخ اُٹھے گی۔ بھلا وہ فتح بھی کوئی فتح ہے جسے کم از کم تیس ہزار کی فوج بہتر بھوکوں اور پیاسوں کے مقابلہ میں اپنے لاتعداد سپاہیوں کو کھو کر جنگ مغلوبہ سے حاصل کرے۔ وہ بہتر جن میں سب لڑنے کے قابل بھی نہ ہوں بلکہ ان میں اسّی برس کا بڈھا اور چھ مہینہ کا بچہ بھی داخل ہو۔ کیا اس فتح پر ناز کرنا انتہا درجہ کی کم ظرفی اور پس نگاہی نہیں ہے؟ کیا یہ فتح حقیقۂ فتح ہے۔ نہیں نہیں وہ شکست ہے جس کی گرد مذلت اس فوج اور اس کی ظالم حکومت پر ہمیشہ کے واسطے چھائی ہوگی۔

یہ خیالات یہاں کے طرب ونشاط کے سامان، خوشی ومسرت کے شادیانوں اور نالے ونوش کی دلچسپیوں کو ایک حساس دل کے لئے بے کیف بنادیتے ہیں...... جی گھبرانے لگتا ہے اور بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ یہاں سے نکل کر میدان کی کھلی ہوا میں سانس لے کر غم غلط کیا جائے ...... وہ دیکھو نہر فرات لہریں لے رہی ہے ...... پانی دور پر سے نظر آرہا ہے کیونکہ راستہ صاف ہے۔ وہ پہرا جو تین دن سے اس پانی پر بیٹھا ہوا تھا اُٹھ چکا ہے۔ وہ ہزاروں سپاہیوں کے پہرے جو رات دن جمے رہتے تھے آج ہٹائے جاچکے ہیں۔ اس لئے کہ وہ شیر جن کے نیم جان بنانے کے لئے پانی کی بندش ہوئی تھی لڑ بھڑ کر ساحل فنا کے اس پار پہنچ چکے ہیں۔

دریا کا کنارا پریشان دل کے سکون کے لئے بہترین جگہ ہے۔ مگر دریا کے ساحل پر خون کی بوآرہی ہے...... موت کے قدموں کے نشان ہر طرف نظر آتے ہیں۔ کسی شیر کے نعروں کی صدا اب تک گونج رہی ہے۔ گرے ہوئے خون کا سلسلہ رہنمائی کرتا ہوا آگے لے جاتا ہے۔ قدم ٹھٹکتے ہیں، دل دھڑکتا ہے۔ ایک لامعلوم رعب کا احساس دور باش کی صدا دیتا ہے......غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ترائی میں ایک شیر آرام کر رہا ہے جس کے گرد وپیش بہت دور تک ساحل کی تمام بالو خون سے گندھی ہوئی ہے۔ جسم تمام زخموں سے چور ہے۔ سر شگافتہ ہے۔ ہاتھ دونوں جسم سے جدا ہیں مگر کٹے ہوئے ہاتھ کے شانہ میں مشک کا تسمہ اب تک پھنسا ہوا ہے۔ وہ مشک جس میں سوراخ ہے اور اس کا پانی تمام بہہ چکا ہے جس نے بہادر کے جسم سے بہے ہوئے خون کی روانی میں اضافہ کر کے زمین مقتل کو دور تک رنگین بنادیا ہے۔ ڈھال تو بہت دور پڑی ہے مگر تلوار دہن کے قریب ہے جھنڈا جو ہوا میں لہرا رہا تھا وہ اب زمین پر ہے مگر بہادر کا سینہ علم کا اب بھی محافظ ہے۔

یہ ہے علیؑ کا شیر حسینؑ کا قوت بازو اور علمدار، پیاسی سکینہ کا سقا قمر بنی ہاشم عباسؑ، جو حسینی فوج کا سب سے آخری سپاہی تھا۔ جس نے سب سے آخر میں حسینؑ سے اجازت جہاد طلب کی مگر امام نے پھر بھی لڑنے کی اجازت نہیں دی۔ فقط بچوں کی پیاس بجھانے کے لئے سبیل کرنے کا حکم دیا۔ وفادار عباسؑ کی یہ یادگار کامیابی تھی کہ وہ فوج کا پہرہ ہٹا کر مشک میں پانی بھر لینے میں کامیاب ہوئے۔ مگر افسوس کہ بھری ہوئی مشک کو لے کر خیمہ تک پہنچنا ممکن نہ ہوا...... تیر نے مشک کو چھید کر تمام پانی بہایا اور عباسؑ نے سیکڑوں زخم کھا کر اپنے جسم کا تمام خون بہادیا۔

عباسؑ مشک وعلم کے ہوتے ہوئے بھی دشمن کے احساس میں بے بس نہیں تھے۔ آخر دونوں ہاتھ جدا کر دیئے گئے پھر بھی عباسؑ جب تک خود گھوڑے سے نہیں گرے علم کو زمین پر گرنے نہیں دیا۔ مگر وہ علم اس کے بعد بھی حقیقت میں گرنے نہیں پایا۔ آج ہزاروں علم اسی ایک علم کی یاد میں ہزاروں کاندھوں پر اُٹھ رہے ہیں اور ہر تعزیہ خانہ میں حسینؑ کے نام کی ضریح تو ایک ہوتی ہے مگر علم کثرت کے ساتھ نصب ہوتے ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس کا کہ عباسؑ تو دنیا میں نہ رہے مگر ان کا علم آج تک اونچا ہے اور ہمیشہ اونچا رہے گا کیونکہ حق کا جھنڈا کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔

یہ منظر یقینی اگر ایک طرف دل میں جوش، ولولہ اور حق پر مر مٹنے کا حوصلہ پیدا کرتا اور رگوں میں خون کی روانی بڑھاتا ہے تو دوسری طرف ایک ایسے بہادر کی لاش کا یہ جاں فرسا عالم دن کی رگیں بھی توڑنے لگتا ہے۔ بے ساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔ وہ آنسو بزدلی نہیں بلکہ بہادری کی قدر وقیمت کے احساس کا نتیجہ ہیں اور عزم وہمت کی آگ کو

افسردہ نہیں بلکہ اس کی شعلہ افروزی میں اضافہ کرتے ہیں۔

دل تو چاہتا ہے کہ حسرت کے اسی ایک منظر میں غرق ہوجائے مگر ساحل کی بلندی سے صحرا کا گلگوں تختہ صاف نظر آتا اور نگاہ کو کشاں کشاں اپنی طرف لے جاتا ہے۔

یہاں کوئی ایک ہی مرقع نہیں ہے جو توجہ کا مرکز بن سکے بلکہ سچ مچ ''شہادت زار'' تو یہی جگہ ہے۔ دور تک لہو کا چھڑکاؤ ہے جا بجا خون کے تھالے بندھ گئے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے نیزے، شکستہ تلواریں، کٹے ہوئے تیروں کے انبار ہیں جو ادھر اُدھر لگے ہوئے ہیں دشمنوں کے سر ہزاروں کی تعداد میں زمین پر لنڈھک رہے ہیں اور لاشے بھی بہت دور تک نظر آتے ہیں۔ ان سب کے بیچ میں بہتّر یا زیادہ سے زیادہ سوا سو نورانی مجسمے خاک وخون میں آلودہ اس عالم میں ہیں کہ کسی کا جسم تیروں سے چھلنی ہے، کسی کا سر گرز سے شگافتہ، کسی کا پہلو خنجر سے چاک اور کسی کا سینہ نیزہ سے فگار ہے۔

ان میں ساٹھ، ستّر اور اسّی برس تک کے بڈھے، ۱۸ سے لےکر ۳۵ برس تک کے جوان اور گیارہ بارہ برس تک کے کمسن بچے بھی ہیں...... ہاشمی خاندان کے جوانوں بلکہ بچوں تک کی سج دھج سب سے الگ ہے۔ ان میں ایک چاند کا ٹکڑا تلوار کا پھل کھائے اس شان سے پڑا ہے کہ عمامہ کے پیچ خون سے رنگین ہوکر لٹک آئے ہیں اور اس حسین چہرہ پر سہرے کی طرح چھا گئے ہیں۔

ہاتھوں میں خون کی مہندی اور سینہ پر زخموں کی بدھی ہے یہ ہے حسنؑ کا یتیم اور حسینؑ کا عزیز بھتیجا قاسمؑ جسے رخصت کرتے وقت امام نے مرحوم بھائی کی وصیت کو پورا کرتے ہوئے اپنا داماد بھی بنالیا تھا...... کربلائے معلّی میں خیمہ گاہ کے اندر ان کی یادگار میں حجلۂ عروسی بنا ہے اور ہندوستان میں ان کی یاد میں ساتویں تاریخ مہندی اٹھتی ہے۔

انہی کے پاس اٹھارہ برس کے کڑیل جوان کا لاشا ہے، جس کے سہرے کے پھول کھلنے کی نوبت نہ آئی، یہ علی اکبرؑ ہیں جنھیں حسینؑ اس لئے بہت عزیز رکھتے تھے کہ وہ ہوبہو رسولؐ اللہ کی تصویر تھے۔ ان کے رخصت ہوتے وقت حضرت امام حسینؑ نے اپنے خالق کو گواہ کرکے کہا تھا کہ جب ہم زیارت رسولؐ کے مشتاق ہوتے تھے تو اس کے چہرہ کو دیکھ لیتے تھے۔ آج کے خوش عقیدہ مسلمان شبیہ نعلین رسولؐ کی بھی جو کاغذ پر بنی ہو عزت کرتے ہیں مگر افسوس وہ کیسے مسلمان تھے جنھوں نے خود رسولؐ کی جیتی جاگتی ہوئی شبیہ کا خیال نہ کیا۔ وہ حسینؑ اور مقدس جسم تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔

علی اکبرؑ کو دیکھتے ہی دل میں علیؑ اصغر کا خیال آتا ہے۔ وہ چھ مہینے کا بچہ جسے حسینؑ نے قربان گاہِ شہادت میں سب سے آخر میں پیش کیا تھا جو پیاس سے جاں بلب تھا مگر پیاس اس کی پانی سے نہیں بلکہ پیکانِ تیر سے بجھائی گئی۔ ان کی لاش تلاش کرنے پر بھی شہیدوں میں نہیں ملتی۔ ہاں زمین پر ایک چھوٹی سی قبر بنی ہوئی ہے۔ یہ اصغرؑ کی تربت ہے۔ اس بچہ کو خود امام حسینؑ نے شہادت کے بعد ہی دفن کردیا تھا۔ شاید اس لئے کہ امت رسول کا یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ فرزند رسولؐ کی انسانی غیرت کو خود اس منظر کے سامنے رہنے سے شرم دامنگیر ہوتی تھی۔

سب سے آخر میں نگاہ نشیب کی طرف جاتی اور وہیں ٹھہر جاتی ہے۔ یہاں ایک تقدس کا ماہ پیکر، نورانی شعاعوں کا خزانہ خونیں شفق کے اندر چمکتا ہوا سورج، ایک ہمہ تن جراحت لاشہ ایسا پڑا ہوا ہے جس کا سر پہلے ہی جدا ہوچکا ہے، اس لئے صورت سے تو پہچانا نہیں جاسکتا مگر زخموں کی کثرت بتلاتی ہے کہ تمام حربوں کا اصلی مقصد اور عداوتوں کا آخری مرکز یہی تھا۔ شکستہ کمر ظاہر کرتی ہے کہ یہ وہ ہے جس کا

برابر کا بھائی مار ڈالا گیا۔ باز و تیر سے چھدا ہوا خبر دیتا ہے کہ وہ ہے جس کے ہاتھوں پر چھ مہینہ کا بچہ نشانۂ تیر ستم ہوا، خون سے رنگین ہاتھ پتہ دیتے ہیں کہ وہ ہے جس نے بے شیر کا خون چہرہ پر مل لیا تھا۔ سینہ پر کشادہ گھاؤ اور پشت کے پار اس کا نشان بتلا رہا ہے کہ وہ ہے جس کے سینہ پر تیر پڑا تو سامنے سے نکل نہ سکا، آخر پشت کی جانب سے اسے کھینچا اور سینہ سے خون پرنالے کی طرح جاری ہوا۔ جسم کے پارہ پارہ ٹکڑے اس کی دلیل ہیں کہ وہ ہے جس کا جسم بعد شہادت گھوڑوں کے سموں سے پامال کیا گیا۔

ان خصوصیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہے شرافت کی جان، انسانیت کی روح، صداقت کا مجسمہ، پیغمبر اسلام کی نشانی، علیؑ کا فرزند حسینؑ جو کربلا کے مجاہدین کا سرگروہ اور اس ہمیشہ یاد رہنے والے کارنامے کی مرکزی شخصیت ہے۔ جس نے جان دے دی مگر حق وصداقت پر آنچ نہ آنے دی جس نے عزت اسلام پر اپنی ہر چیز قربان کر دی اور بقول خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کلمہ لا الہ الا اللہ کی از سر نو بنا قائم کر دی۔

آج ہر سال دنیا کے تمام مشرق ومغرب میں، محرم میں ان ہی کا سوگ منایا جاتا ہے اور ان ہی کی یاد ہے جو مختلف اندازوں پر برابر تازہ کی جاتی ہے۔ اور تیرہ صدیوں سے ہر سال کے بعد دوسرے سال اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔

تاریخ اسلام میں واقعۂ کربلا کی اہمیت

(سرکار سید العلماء مدظلہ کی وہ معرکتہ الآراء تقریر جو ۱۶ ؍ربیع الاول ۱۳۶۵ھ مطابق ۹ ؍فروری ۱۹۴۶ء کو مختلف مذاہب واقوام کے ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ہوئی)

تاریخ اسلام کی ابتدا کب سے ہوتی ہے؟ مذہبی نقطۂ نظر سے تو اسلام اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ دنیا وجود میں بھی نہ آئی تھی اور آدم ونیز دیگر انبیاء ومرسلین اسلام ہی کا پیغام لے کر دنیا میں آئے لیکن مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے خالص تاریخی حیثیت سے تاریخ اسلام کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے کہ جب سے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث برسالت ہوئے۔

اس وقت کی حالت یہ تھی کہ دنیا کے مختلف ممالک میں جن رہنماؤں کی تعلیم جاری تھی ان میں کسی میں بھی ہمہ گیر انسانی برادری کا تخیل موجود نہ تھا بلکہ یہ تعلیمات صرف ایک قوم، ایک ملک اور ایک زمانہ میں محدود تھے۔ ہندوستان ہی کو لے لیجئے یہاں جس طرح کی تعلیم رائج تھی اس نے اپنے پیغام کو سمندر کے حدود کا پابند بنا دیا تھا۔ وہ اپنے ماننے والوں کو سمندر کے عبور کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا تو اسے سمندر پار والوں کی اصلاح کی فکر کیا ہوتی۔

دوسرا بڑا مذہبی ادارہ عیسائیت کا تھا، اس کی تعلیم کا زاویۂ نگاہ جو رواج یافتہ بائبل میں پایا جاتا ہے اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اللہ کو صرف بنی اسرائیل کا باپ قرار دیتا ہے۔ اگر اللہ کو صرف اس کے رحم وکرم اور عنایت کی بنا پر باپ کے نام سے تعبیر کیا جاسکے تو اس کی رحمت کا مستحق دنیا کے سارے انسانوں کو ہونا چاہئے مگر عیسائیت کی مذہبی تعلیم اس وسیع النظری سے خالی تھی۔

خود عرب کے لوگ اپنے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنا نام رکھا تھا ''عرب''، یعنی دل کی بات کو زبان سے ظاہر کر سکنے والے اور اپنے سوا دوسری قوموں کو کہتے تھے ''عجم''، یعنی گونگے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے سوا دیگر اقوام کی زبانوں کو انسانی

زبان ماننے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ جیسے جانور کچھ آوازیں منھ سے نکالتے ہیں ویسی ہی دوسری قوموں کی بولیاں ہیں۔

ایسے زمانہ میں حضرت محمد مصطفی اسلام کا پیغام لے کر آئے جس کا خاص جوہر تھا ''بین الاقوامیت'' یعنی وہ صرف عربوں کے لئے نہیں بلکہ دنیا کی تمام قوموں کے لئے تھا۔ ابھی تک کسی نے اتنا بڑا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کل انسانوں کو اخوت اور مساوات کا سبق دیا۔ ذات پات کے بدنما داغوں کو دامن انسانیت سے دھو ڈالا۔ کل انسانوں پر یکساں فرائض عائد کئے اور سب کے حقوق مساوی رکھے۔ آپ نے اعلان عام کر دیا ''لَا فَخرَ لِلْقَرَشِیِّ عَلیٰ غَیْرِ الْقَرَشِیِّ وَلَا لِلعَرَبِیِّ عَلیٰ غَیْرِ الْعَرَبِیْ'' کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور نہ عربی کو غیر عربی پر سب آدم کی اولاد ہیں (خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ) اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔

یہ اب ہمیں آسان معلوم ہوتا ہے جب کہ ہمارے کان سنتے سنتے عادی ہو چکے ہیں لیکن جس زمانہ میں رسولؐ ان خیالات کو پھیلا رہے تھے اس وقت دنیا ان سے بالکل اجنبی تھی۔ اس وقت دنیا کی تمام قوموں میں برادرانہ برتاؤ کا قائم کیا جانا کیسا اپنے ہی ملک وقوم کے دوسرے قبیلہ کے افراد کی اپنے سامنے کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ اس ماحول کے اعتبار سے رسولؐ کا یہ اقدام ایک بڑی غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ قول سے عمل مشکل ہے۔ رسولؐ نے زبانی ہی تعلیم نہ دی بلکہ ہر موقع پر خود عمل کر کے دکھایا۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے دنیا کے سامنے ایک بین الاقوامی قوم کی تشکیل کر کے دکھا دی جس میں اگر ایک طرف حمزہ وجعفر ایسے قرشی تھے تو دوسری طرف ابوذر غفاری اور مقداد کندی ایسے غیر قرشی اور پھر سلمان فارسی، بلال حبشی اور صہیب رومی ایسے غیر عرب۔ اتنا ہی نہیں بلکہ سلمان کو منا اھل البیت کہہ کے اعزاز میں اپنے خاندان کا شریک کر لیا اور بلال کو موذن کے معزز عہدہ پر فائز کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اگر کوئی شخص کسی بلند عہدہ ومنصب کا اپنے ایمان وعمل سے حقدار ہو تو اس میں رنگ، نسل اور ملک کے افتراق کی ہرگز پرواہ نہیں کرنا چاہئے۔

حقیقی مصلح وہی ہے کہ جو ماحول کے خلاف، رائے عامہ کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ضروری اقدام عمل میں لائے۔

رسولؐ اللہ کی جانب سے تمام دنیا کے سامنے ایک ایسی تعلیم کو پیش کرنا چاہتے تھے جو اُسے بلند انسانی سطح پر پہنچا دے اسی لئے انھوں نے تمام اقوام عالم کے سامنے ایسا انداز اختیار کیا جس میں عقل وانصاف کی رو سے کسی کو بنائے مخاصمت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ تمام قدیم پیشوایان مذاہب میں اس کا فیصلہ کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے کہ کون پیشوا حقیقت میں منصب رسالت پر فائز تھے اور کون نہیں تھے تو وہیں سے ایک جنگ ان شخصیتوں کے بارے میں قائم ہو جاتی جس کا کوئی عملی نتیجہ انسانی کردار کے مستقبل کے لحاظ سے نہ تھا اس لئے انھوں نے اقوام عالم کے گزشتہ پیشواؤں میں سے نفی کسی کی نہیں کی۔ بلکہ قرآن میں کچھ کے نام کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ ''رُسلاً قَدْ قَصَصْنَاھُمْ عَلَیْکَ وَرُسلاً لَمْ نَقْصُصْھُمْ عَلَیْکَ'' ''کچھ پیغمبروں کا ہم نے تمہارے سامنے ذکر کیا ہے اور بہت سے پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا ہے'' ہر ایک مذہب کے قدیم پیشوا کے لئے یہ امکان باقی رہ گیا کہ اس کا شمار بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں ہوا اور اس طرح یہود کے لئے جس طرح یہ موقع ہے موسیٰ کی عظمت کے قائل رہتے ہوئے، عیسائیوں کے لئے موقع ہے عیسیٰ کی عظمت بشری کے قائل رہتے ہوئے اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں، اسی طرح پارسیوں کے لئے موقع حاصل ہے زردشت کی عظمت کو ماننے کے ساتھ، ہندوؤں کے

لئے موقع ہے اپنے سابق پیشواؤں کی عظمت کو انسانی حدود میں ماننے کے ساتھ اسلام کے پیغام کو قبول کرلیں۔ اب سابق شخصیتوں کے احترام اور عدم احترام پر کوئی بحث نتیجہ خیز بھی نہیں جب کہ آئندہ کے لئے لائحہ عمل سب کی طرف سے ایک قبول کرلیا جائے اور وہ وہی کہ جسے اسلام دنیا کے سامنے پیش کررہا ہے۔

یہی ہے بین الاقوامی جماعت کو متحدہ مقصد پر مجتمع کرنے کا صحیح طریقہ جسے اسلام نے اختیار کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی بے شک قرآن عربی زبان میں اُترا۔ اس میں ایک پہلو تھا اس کا کہ عرب قوم جو دوسروں پر فوقیت کی دعوے دار تھی اسے اپنے لئے باعث فخر قرار دیتی مگر قرآن نے اس پہلو کی تشریح کرکے عرب کے اس فخر کو ختم کردیا۔ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ فقرأه عَلَيْهِمْ مَا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ۔ یعنی قرآن کے عربی زبان میں نازل ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ عربوں میں جہالت اور تنگ نظری ایسی ہے کہ اگر یہ کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو یہ ایمان نہ لاتے برخلاف دوسری قوموں کے وہ اس تنگ نظری سے دور ہیں۔ وہ باوجود قرآن کے عربی ہونے کے ایمان لانے کے لئے تیار ہوسکتی تھیں اس لئے قرآن عربی میں اتارا گیا۔ اس طرح قرآن مجید نے جو ایک پہلو عرب کی فوقیت کا پیدا ہوتا تھا اسے ختم کردیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی بین الاقوامیت کے یہ معنی نہ تھے کہ ایک قوم یعنی عرب کا غلبہ تمام دوسری قوموں پر ہوجائے بلکہ اس کے معنی یہ تھے کہ عرب اور تمام دوسری قومیں یکساں طور پر اسلام کے بلند وبرتر نظریات عقلی اور اصول اخلاقی واجتماعی کو قبول کرکے ایک متحد قوم بن جائیں اس طرح وہ کسی سے کوئی چیز چھیننے کا درپے نہ تھا، بلکہ سب کو مساوی طور پر کچھ دینے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا اور اسی لئے کسی دوسری قوم کا آدمی اسلام قبول کرکے کسی شکست یا پسپائی کا احساس نہیں کرتا تھا بلکہ فخر اور نازش محسوس کرتا تھا۔

اسلام کے ان تعلیمات میں جبر کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے صاف اعلان کردیا کہ (لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ) بلکہ تبلیغ مذہب کا صرف ایک ذریعہ تھا کہ اپنے حقانیت اور عمل سے دلوں کو مسخر کیا جائے اور اپنے اصول کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ اس سے متاثر ہوکر اس کی خوبیوں پر غور کرے اور مسلمان ہو۔

یہ ہے اسلامی تاریخ کے دور اول کا وہ سرسری بیان جس سے اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور رسولؐ کے تبلیغی طریقہ کا ایک تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ اس کے بعد تاریخ کا ورق اُلٹتا ہے۔ رسول کی وفات ہوتی ہے اور مسلمانوں کے فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے۔

کوئی شبہہ نہیں کہ ان فتوحات کی بنیاد اسی بین الاقوامی تخیل پر تھی جو اسلام نے مسلمانوں کے دماغوں میں پیدا کیا تھا مگر اس بین الاقوامیت کے حصول میں پیغمبرؐ کے طریق کار کی نوعیت پر عام طور سے غور نہیں کیا گیا یا نگاہیں اس کی تہہ تک نہیں پہنچیں اور نہ پہنچنا چاہئے تھا کیونکہ پیغمبرؐ کے عمق نگاہ کی توقع امتیوں کے عوام سے کہ جن کا جمہور نام ہے فضول ہی سی چیز ہے۔ پیغمبرؐ اسلام کے پیش نظر بھی فتوحات تھے اور مسلمانوں کی نظر بھی فتوحات پر رہی مگر فتوحات کے مفہوم میں دونوں جگہ فرق تھا۔ مسلمانوں کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کے ملک ان سے لے کر اپنے بنالیے جائیں اور پیغمبرؐ اسلام کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کو خود اپنا لیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا ملک اپنا ہوجائے۔ پہلی قسم کے فتوحات میں زمینوں پر قبضہ کیا جاتا ہے اور دوسری قسم کے فتوحات میں دلوں کو تسخیر کیا جاتا ہے۔

یہ فتوحات جنھیں مسلمانوں نے اپنا نصب العین بنایا اس سے ممالک تو اپنے ہو گئے مگر ممالک کے رہنے والے ان فتوحات سے ہرگز اپنے نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اس طرح کی فتح کا ایک خاصہ ہے یہ کہ مفتوح قوم میں فاتح کی طرف سے جذبۂ نفرت پیدا ہوتا جائے جب دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا تو اچھائیوں پر نظر جائے گی نہیں اور جب اچھائیاں دیکھی نہ جائیں گی تو دلوں میں ایمان کا رجحان کیا پیدا ہوگا۔

اس قسم کے فتوحات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح کے خلاف فرد قرارداد جرم مرتب کرے اور صحیح یا غلط مظالم کی داستانیں دہرائے۔ تاریخ پر نظر ڈالیے تو اسلامی فتوحات اس سے مستثنیٰ نظر نہ آئیں گے۔

مان لیا جائے کہ کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام غلط ہے مگر اس غلط الزام کا عائد ہونا اور بالکل ایسے ہی الزام کا ایران کی طرف سے عائد کیا جانا جسے مولانا شبلی نے شعرالعجم میں بھی نقل کیا ہے یعنی یہ کہ ایران کے قدیم شاعری ....اور ادبی لٹریچر کا ذخیرہ باقی نہیں رہا اس لئے مسلمانوں نے ایران کے تمام قدیم سرمایہ کو تلف کر دیا اور ان غلط الزاموں کا بالکل یکساں دو ملکوں کی طرف سے عائد کیا جانا خود اس کا ثبوت ہے کہ مفتوحہ ممالک کو فاتح جماعت کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی جب کہ مخاصمت تھی ویسی ہی جیسی ہر مفتوح قوم کو فاتح کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

رسولؐ نے دکھا دیا تھا کہ دیکھو ممالک یوں فتح کئے جاتے ہیں۔ حضرت علیؑ کو فتح یمن کے لئے بھیجا اور انھوں نے بغیر ایک قطرہ خون بہائے ہوئے تمام ملک کو اپنا بنا لیا۔ مگر مسلمانوں نے اس مثال کو یاد نہیں رکھا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملک تو اپنے ہو جائیں مگر ملک والے اپنے نہ ہوں۔

آل محمدؐ جن کے سرگروہ حضرت علی بن ابی طالبؑ تھے اس صورت حال کو دیکھ رہے تھے اور اس کے نتیجہ کو محسوس کر رہے تھے انھوں نے بمصالح سیاستِ وقت کی رفتار میں مزاحمت مناسب نہیں سمجھی مگر انھیں الگ تھلگ اور خاموش رہ کر بھی اس کام کو انجام دینا تھا جو پیغمبرؐ اسلام کی قائم مقامی میں ان کے پیش نظر تھا۔ اگر چہ ان کا کام بہت مشکل بن گیا تھا مگر ایک فرض شناس شخص مشکلوں سے گھبرا کر اپنے فرض کو ترک نہیں کیا کرتا۔ انھوں نے اپنا کام یہ قرار دیا کہ غیر ملک کی زمینوں کو مسلمان اپنے قبضہ میں لائیں اور ان کے دلوں کو آل محمدؐ اپنے عمل اور سیرت کے جذب سے اپنا بنائیں اور اس طرح ان میں اسلام کے ساتھ حقیقی ہمدردی پیدا کریں۔

اسی مقصد سے حضرت علیؑ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بجائے مکہ یا مدینہ کے کوفہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ یہ عراق کا مرکزی شہر تھا جو ایران اور حجاز دونوں کے بیچ میں واقع ہے۔ کوفہ فوجی چھاؤنی تھا اور چھاؤنی میں بداخلاقیاں کثرت سے ہوتی ہیں۔ ایران کے لوگ جب یہاں آتے تو وہ ان ہی اخلاق و کردار کو جو یہاں نظر آتے اسلامی کردار خیال کرتے اور اس کی وجہ سے اسلام کے خلاف ان کی نفرت سے مستحکم ہوتی جاتی۔

جناب امیرؑ نے یہاں قیام فرما کر اور اسے خاندان رسول اور اپنے تربیت دادہ سچے مسلمانوں کی جماعت کا مرکز قرار دے کر یہ موقع فراہم کر دیا کہ ایران والے قریب سے اسلامی اخلاق و آئین کا مطالعہ کریں اور اس کے بلند انسانی خصوصیات کو محسوس کریں۔ جب کہ آپ عملی طور پر اسی بین الاقوامی مساوات کو سختی کے ساتھ نباہ کر دنیا کو دکھا رہے تھے جو پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ جہاں غیر قرشی مالک اشتر کی اتنی عزت تھی جتنی بڑے بڑے خاندانی قرشیوں

کی نہ تھی۔ اور قنبر غلام کے ساتھ وہ مراعاتیں تھیں جو بہت سے عربوں کے ساتھ نہ تھیں۔ جہاں انسانی حقوق میں مساوات کا اتنا خیال اور ملکی وغیر ملکی تفریق کے خلاف جہاد میں اتنا اہتمام تھا کہ عرب شہنشاہ زادہ (عبید اللہ بن عمر) نے اگر ایک ایرانی (ہرمزان) کو ناحق قتل کردیا تھا اور گذشتہ دور حکومت میں قاتل کی شخصیت کے اثر سے اس کا بدلہ نہ لیا گیا تھا تو اب حضرت علی بن ابی طالبؑ خلیفہ ہونے کے بعد اعلان کردیتے ہیں کہ اس ایرانی کے خون کا بدلہ لیا جانا قاتل سے ضروری ہے۔ اسلامی قانون میں عرب اور غیر عرب اور بڑے اور چھوٹے کی تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمر جا کر حضرت علیؑ کے فریق مخالف یعنی معاویہ کے ساتھ مل جاتے ہیں اور پھر میدانِ جنگ میں حضرت علیؑ کے مقابلہ میں آکر قتل ہوتے ہیں۔

کیا اس سے اسلام کی اس بین الاقوامیت کا جو اس کا طرۂ امتیاز ہے ایرانیوں کو اندازہ نہ ہوگا اور کیا اس سے انھیں اسلام کے بلند اصول کے ساتھ ہمدردی نہیں پیدا ہوئی ہوگی۔

دوسرا واقعہ ایران کی شاہزادی کا حضرت امام حسینؑ کے عقد میں آنا تا کہ ایرانیوں اور عربوں میں رشتۂ اتصال قائم ہوجائے اور ملک وقوم کی تفریق کے مٹا دینے کا عملی سبق دنیا کو دیا جائے۔ اس وقت جب شہنشاہِ فارس کی بیٹی کے دامن پر کنیزی کا داغ آرہا تھا، امیر المومنینؑ نے اپنے عزیز فرزند کے ساتھ اس کا عقد کرکے اس کو دنیائے اسلام کی ملکہ بنا دیا۔

کیا اس سے بڑھ کر ایران کو اسلام کا گرویدہ بنانے کی کوئی صورت ہوسکتی تھی کہ آئندہ کے ہونے والے اسلامی پیشوا (زین العابدینؑ) اگر ایک طرف ملک عرب کے دینی شہنشاہ (محمدؐ و علیؑ) کے پوتے ہیں تو دوسری طرف ملک فارس کے شہنشاہ (یزدجرد) کے نواسے بھی ہیں۔

اس کا نتیجہ تھا کہ مفتوحانہ تقرب جو ایران کو فاتح قوم اور اس کے مذہب سے ہونا چاہئے تھی دور ہوگئی اور اگر رہی بھی تو صرف ان اشخاص سے جنھوں نے براہ راست ان پر فوج کشی کی تھی لیکن اسلام اور رہنمایان اسلام سے مذہبی طور پر انھیں کوئی نفرت نہیں باقی رہی بلکہ دلی محبت والفت اور والہانہ شیفتگی وگرویدگی پیدا ہوگئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بعد اسلامی علوم اور مذہب کی جتنی خدمت ایران نے کی اتنی خود عربوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

چاہے سواد اعظم کے وہ قدیم اور متوسط دور کے علماء ہوں جیسے بیہقی، نسائی، طبری، رازی، دوانی، جرجانی، نیشاپوری وغیرہ اور چاہے فرقۂ امامیہ کے ہر دور کے علماء ہوں جیسے قمی، طوسی، خوانساری، اصفہانی، رشتی، شیرازی، مازندرانی، طہرانی، یزدی وغیرہ سب ہی سرزمین ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک اور ثبوت ایران کے مذہبی شغف کا دیکھئے کہ ایران میں جمشید کا قائم کیا ہوا تہوار ''نوروز'' ہمیشہ منایا جاتا تھا۔ یہ ''نوروز جمشیدی'' کہلاتا تھا جو اعتدال ربیعی کے موقع پر قائم ہوتا تھا اس کے مقابل ''مہرگان'' تہوار تھا جو اعتدال خریفی کے موقع پر یعنی موسم خزاں میں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کو اپنے قومی تہواروں اور قومی شخصیتوں کے ساتھ محبت ہوا کرتی ہے مگر چونکہ نوروز ہی کا دن مطابق ہوگیا حضرت امیر المومنینؑ علی بن ابی طالبؑ کی جانشینی کے دن سے تو ایران نے اپنے مخصوص تہوار کی قومی خصوصیت کو قربان کردیا اس مذہبی خصوصیت پر جو اس تاریخ کو حاصل ہوگئی تھی اور نوروز بجائے ''نوروز جمشیدی'' ہونے کے ''نوروز اسلامی'' اور ''نوروز علوی'' بن گیا۔ اب اس میں اسلامی نماز پڑھی جاتی ہے اور

حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اوصاف ومناقب بیان ہوتے ہیں اور جمشید کے ساتھ جو اس دن کا تعلق تھا وہ صرف تاریخ کے اوراق پارینہ کی زینت بن کے رہ گیا ہے۔

یہ وارفتگی اور شیفتگی مذہب کے ساتھ بضرب شمشیر فتح سے حاصل شدہ نہیں ہوسکتی بلکہ اس میں آل محمدؐ کے اس اخلاقی جذب کی تاثیر ہے جس کی امیر المومنین حضرت علیؑ نے ابتدا کی اور آل محمدؐ میں سے ہر فرد نے جس کو برقرار رکھا اور امام رضاؑ نے اپنے ولی عہدی کے دور اور زمانۂ قیام خراسان میں جس کو لازوال زندگی بخش دی۔

یاد رکھئے کہ دنیا کے ہر انسان کے چال چلن کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ ہر شخص لامعلوم طریقہ پر اپنے افعال وحرکات سے دوسروں پر اچھا یا برا اثر ڈالتا رہتا ہے اور وہ دوسرے اپنے علاوہ دوسروں پر اثر ڈالتے ہیں یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے کسی نیک شخص کی پارسائی، رحم دلی، فیاضی، ملنساری، ہمدردی وغیرہ اوصاف کو اہمیت دینا غلطی ہے مگر تاریخ کا ایک خاصہ ہے کہ وہ حرکت کو دیکھتی ہے مسکون پر نظر نہیں ڈالتی۔

اگر آپ ملکوں کی تاریخ، قوموں کی تاریخ، اور شخصیتوں کی تاریخ کو پڑھیے تو آپ کو جنگ، ہنگامہ، شورش اور آویزشوں کے حالات بڑے شرح وبسط کے ساتھ ملیں گے لیکن عبادوزہاد کی عبادتوں، ریاضتوں، اور تعمیر خلق کی کوششوں کا تذکرہ اکثر ملے ہی گا نہیں اور ملے گا تو ضمنی طور پر، سرسری طریقہ سے اور اختصار کے ساتھ۔

تاریخ اسلام اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی تھی چنانچہ فارس وروم کے غزوات تاریخ کے صفحات پر چھا گئے۔ فتوح الشام، واقدی اور فتوح البلدان، بلاذری اسم بامسمیٰ ہو کر ان ہی موضوعات کی حامل بن گئیں مگر یہودیوں کے باغ میں آب کشی کر کے بسر اوقات کرنے والا پیغمبر اسلامؐ کا جانشین اس دور کی تاریخ میں ڈھونڈھے نہیں ملتا۔ حضرت علیؑ کے علاوہ دیگر اماموں کے واقعاتِ زندگی صفحاتِ تاریخ پر نہ آسکے کیونکہ ان میں کمانوں کی کڑک، نیزوں کی لچک، اور تلواروں کی چمک نہ تھی مگر خالد بن ولید سے لے کر ابومسلم خراسانی تک جتنے جرنیل اور کرنیل تھے سب تاریخی شخصیت بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ شخصیتیں دنیا کی خاموش فضا میں تلاطم پیدا کرنے کی وجہ سے تاریخ کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور زین العابدینؑ، محمد باقرؑ، جعفرؑ صادق، موسیٰ کاظمؑ وغیرہ اپنی عبادت، اپنے علم، اپنے صدق، اپنے ضبط نفس وغیرہ صفات کمال سمیت تاریخی معیار پر پورے نہیں اُترتے اس لئے کہ وہ اپنی خاموش سیرت کے ساتھ دنیائے اسلام کی تعمیر میں کتنا حصہ لے رہے ہوں مگر ان کی زندگی میں سکون ہے۔ اور سکون تاریخ کا جزو بننے کے قابل نہیں۔ اس صورت سے جو اسلامی تاریخ مرتب ہوئی ہوتی اس میں یقینا بس وہ خون آشام لڑائیاں ہوتیں جو اشاعت اسلام کے نام پر فتوحات کی حیثیت سے آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کی صورت میں ہوئیں اور ایسی تاریخ سے مسلمان اپنی جگہ کتنی ہی نازش محسوس کرتے مگر غیر اقوام کی ہمدردی کا کوئی سرمایہ ان میں دستیاب نہیں ہوسکتا تھا۔

ضرورت تھی ایک ایسے واقعہ کی جس میں ہو تو نوعیت جنگ کی، ہو باہمی تصادم اور کشمکش، زمین پر بہتے ہوئے خون اور تڑپتے ہوئے لاشے ہوں، فتح اور شکست اور غالب ومغلوب کا انجام ہو خلاصہ یہ کہ وہ سب باتیں ہوں جن کی وجہ سے تاریخ کی نگاہ اُٹھتی ہے جن کی وجہ سے تاریخ اپنی آغوش کو کھولتی اور واقعات کو جگہ دے دیتی ہے مگر اس جنگ کی تہہ میں

اسلام کے سچے اصول کی جاذبیت، اس کی مساوات واخوت۔ اس کی خلق خدا کے ساتھ ہمدردی، اس کی حقوق اللہ وحقوق الناس کی محافظت اوراس کی انسانیت کی تعمیر میں تمام کوششوں کا نچوڑ اس طرح مضمر ہو کہ اس جنگ کے ساتھ ساتھ یہ تمام باتیں ایسی ہی یا اس سے بہتر تاریخی زندگی حاصل کرلیں جیسی فتوحات ملکی والی لڑائیوں کو حاصل ہے۔

اس واقعہ کے وجود سے تاریخ اسلام میں غیر اقوام کے لئے وہی جاذبیت اور وہی مقناطیسیت پیدا ہوسکے گی جو اصل اصول اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی سیرت زندگی میں موجود تھی اور جس پر فاتحانہ لڑائیوں نے نفرت کے جذبات کا پردہ ڈال کر اقوام عالم کی آنکھوں سے اوجھل کردیا تھا۔ واقعۂ کربلا بس ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔ یہ ایک جنگ تھی اور جنگ بھی انوکھی خصوصیتوں اور مخصوص ندرتوں کی حامل جن کی وجہ سے کسی دوسری جنگ سے زیادہ تاریخ اس کو محفوظ رکھنے پر مجبور تھی۔ یہاں بھی کھنچی ہوئی تلواریں تھیں، لچکتے ہوئے نیزے تھے، کڑکتی ہوئی کمانیں اور سنسناتے ہوئے تیر تھے۔ زمین پر بہتا ہوا خون، کٹے ہوئے سر اور تڑپتے ہوئے لاشے اور پھر جنگ ایسی جس میں ایک طرف ۳۰ ہزار اور دوسری طرف بہتر، ایک طرف سیر وسیراب اور دوسری طرف تین دن کے بھوکے پیاسے، ایک طرف تن وتوش والے قد اور جوان اور دوسری طرف چند جوانوں کے علاوہ اسی برس کے بڈھے اور کمسن بچے، کون سی دنیا کی جنگ ایسی ہوئی ہوگی جس میں قاسمؑ کے ایسے نابالغ کمسن کا کیا ذکر علی اصغرؑ کا سا شیر خوار بھی قربان ہوا ہو۔

لہٰذا بحیثیت جنگ کے تاریخ مجبور تھی کہ اس واقعہ کے خصوصیات کو محفوظ کرے۔ اب اگر یہ جنگ بھی کھلم کھلا کسی غیر مسلم جماعت اور دوسری قوم کے مقابلہ میں ہوئی ہوتی تو غیر اقوام کو اس سے ہمدردی نہ پیدا ہوتی بلکہ وہ اسے اسلام کی دوسری لڑائیوں کے ساتھ جو اقوام غیر اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہوئی ہیں منسلک کرکے اس سے غیریت بلکہ مخاصمت محسوس کرتیں مگر اس جنگ کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ رسمی طور پر کسی ایک مذہب کی حمایت میں دوسرے مذہب کے خلاف نہ تھی بلکہ ظاہری طور پر ایک ہی مذہب (اسلام) کے پیرووں میں جو لوگ اس کے اخلاق اور بلند تعلیمات سے ہٹ گئے تھے ان کے خلاف لڑی گئی تھی۔ اس لئے دنیا کی کسی دوسری قوم کو اس سے مخاصمت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور انھیں اس کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ان سے اسلام کے ان اصول اور اخلاقی حدود کا تعارف ہوتا ہے جو حسینؑ اور یزید کے درمیان خط فاصل بنے ہوئے تھے اور وہ جب حسینیت کی ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ان اصول پر غور کرتے ہیں تو ان کے دلوں پر اسلام کی عظمت کا سکہ قائم ہوتا ہے اور یہی وہ مقصد تھا جو پیغمبر اسلامؐ کے پیش نظر تھا اور جس کی حسینؑ نے اپنے خون سے تکمیل کی۔

یہ ایک بڑی خصوصیت ہے واقعۂ کربلا کی جو اسے تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کا مالک بنا دیتی ہے یعنی اگر تاریخ اسلام سے واقعۂ کربلا کو نکال دیا جائے تو غیر اقوام کی ہمدردی کے لئے کوئی چیز ہمارے پاس نہیں رہ جاتی اور یہ ایک ثابت حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو حسینی واقعات سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

پھر امام حسینؑ نے اپنے واقعات کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو ایسا مدغم کردیا ہے کہ حسینی تاریخ بغیر ان تعلیمات کے تذکرہ کے مرتب ہی نہیں ہوسکتی اور اس طرح ان واقعات کے ساتھ وہ تعلیمات بھی قہری طور پر تاریخ کا جزو بن گئے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے واقعہ کی تاریخی حیثیت

ایک مخصوص نوعیت کے ساتھ وابستہ ہے۔

خم شمشیر تاریخ کا جزو بنتا ہے مگر خم محراب نہیں۔

تیروں کی بارش تاریخ کی توجہ مبذول کرتی ہے، خوف الٰہی سے آنسوؤں کی بارش نہیں۔ پھڑکتی ہوئی لاشوں کو تاریخ دیکھتی ہے، سجدہ الٰہی میں زمین پر گری ہوئی پیشانیوں کو نہیں۔ مگر حسینؑ نے کربلا میں یہ کیا کہ تیروں کی بارش میں نماز جماعت ادا کی۔ اب کیا ممکن ہے کہ تاریخ اس نماز کو نظرانداز کردے، خنجر کی دھار کے نیچے خالق کا سجدہ کیا۔ اب کیا مجال کہ تاریخ اس سجدہ سے آنکھ بند کرلے۔

اس طرح امام حسینؑ نے تعلیمات اسلام کو تاریخی زندگی کا لباس پہنا دیا جس کی مثال واقعۂ کربلا کے سوا تاریخ اسلام کے کسی واقعہ میں نہیں مل سکتی۔

کربلا میں مادیت پرستی اور حق پرستی کا مقابلہ صاف نظر آتا ہے۔ جب میدانِ جنگ میں صفیں مرتب ہوتی ہیں اور فوج شام کا افسر عمر بن سعد تیر چلۂ کمان میں جوڑ کر حضرت امام حسینؑ کی طرف رہا کرتا ہے، پکار کر اپنی فوج کو آواز دیتا ہے کہ گواہ رہنا، پہلا تیر فوج حسینؑ کی جانب میں لگا رہا ہوں۔ یہاں گواہ کئے جارہے ہیں فوج کے سپاہی۔ کاہے کے لئے؟ حاکم وقت کے سامنے گواہی دینے کے لئے۔ صاف ظاہر ہے کہ صرف مخلوق کی رضامندی اور ماڈی فائدے کا حصول مدنظر ہے۔ اور ادھر جب حسینؑ کا جوان بیٹا رخصت ہو کے مرنے چلتا ہے تو زبان پر کیا الفاظ آتے ہیں ''خداوندا گواہ رہنا کہ اب وہ جوان جارہا ہے جو صورت وسیرت میں تیرے رسولؐ کی تصویر ہے۔''

صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ کیا جارہا ہے وہ صرف اللہ کی خاطر اور خالق کی رضامندی کے لئے۔

کیا تاریخ کربلا کی جنگ سے اس خدا پرستی کے مظاہرہ کو الگ کرسکتی ہے؟ ناممکن ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ گھریلو واقعات جن میں قرابتداروں کے باہمی حقوق، گھر والوں کے ساتھ برتاؤ، باہمی محبت وسلوک کے کتنے ہی تابناک عمل کے جواہرات ہوں مگر تاریخ انھیں مڑکر نہیں دیکھتی۔

حضرت امام حسینؑ کربلا میں اپنے عزیزوں کو اور اس سے بھی بڑھ کر اہل حرم یعنی بی بیوں اور بچوں کو ساتھ لائے اور اب حسینی کارنامہ کے ذیل میں اعزا کے حقوق قرابتداری، بہن اور بھائی کی غیر معمولی محبت، شوہر اور زوجہ کی باہمی وفاداریاں غرض کتنے ایسے زندگی کے پہلو مضمر ہوگئے ہیں جنھیں عموماً تاریخ اپنے دامن میں لیتی ہی نہیں۔

اس کا قطعی ثبوت چاہتے ہوں تو یہ دیکھئے کہ آخر حضرت امام حسینؑ ۱۰ر محرم ۶۱ھ کے پہلے بھی تو امام حسینؑ ہی تھے۔ یقینا آپ کی پوری زندگی ہی حقوق اللہ اور حقوق الناس اور اعزاء کے ساتھ صلۂ رحم اور گھر والوں کے ساتھ مراعات میں ایسی ہی مثالی تھی کہ جیسی وہ کربلا کے میدان میں نظر آتی ہے مگر کیا بات ہے کہ ستاون برس کی عمر میں صرف ایک ہی دن کے جزئیات وواقعات ہیں جو تاریخ کی زبان سے ہم تک پہنچتے ہیں اور اس دن کے پہلے کے ستاون برس کے واقعات ہرگز مسلسل اور مرتب طور پر ہمیں دستیاب نہیں ہوتے۔

اب تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ صرف واقعۂ کربلا کی خصوصیت ہے کہ اس میں رزمیہ کارنامہ کے ساتھ چونکہ زندگی کے دوسرے پہلو منسلک ہوگئے تھے اس لئے انھیں تاریخی زندگی حاصل ہوسکی اور اب آپ کو واقعۂ کربلا کی مخصوص اہمیت تسلیم کرنا پڑے گی جس نے تمدن اسلامی کے ہر اجتماعی اور انفرادی، معاشرتی اور منزلتی پہلو کو اس طرح تاریخ کا جزبنا دیا جو بغیر اس کے قطعاً ناممکن تھا۔

❀❀❀